The Depiction of the Decline of Artistic Traditions in Nayyer Masood's Short Stories

نیئر مسعود کے افسانوں میں علوم و فنون کے زوال کی عکاسی

Dr Muhammad Amjad*[1]
Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad.
Dr.Humaira Ishfaq [*2]
Associate Professor,Department Of Urdu, International Islamic University Islamabad.

[1*] ڈاکٹر محمد امجد
شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
[2*] ڈاکٹر حمیرا اشفاق
پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Correspondance: humaira.ashfaq@iiu.edu.pk

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 27-02-2025
Accepted:26-03-2025
Online:28-03-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY)

ABSTRACT: This study examines the depiction of the decline of scholarly and artistic traditions in Nayyar Masood's short stories. His works capture the fading intellectual and cultural heritage of Lucknow, where once-flourishing sciences and arts succumbed to socio-political and economic shifts. Through symbolism and layered narratives, Masood illustrates the erosion of traditions such as Unani medicine, perfumery, embroidery, and architecture, portraying them as both cultural losses and civilizational tragedies.Masood's engagement with these themes is deeply personal, reflecting his awareness of Lucknow's changing artistic and scholarly landscape. His fiction serves as both a lament and a preservation of cultural memory, highlighting the fragility of indigenous knowledge and artistic heritage. By portraying this decline, his stories prompt reflection on the importance of cultural preservation in contemporary times.

license

KEYWORDS: Decline, Knowledge, art, Culture, Change, Lakhnau,

نیئر مسعود کا فن بنیادی طور پر علامتوں کا فن ہے، جو اپنے افسانوں کے ذریعے معنی کی پیچیدہ تہیں تشکیل دیتا ہے۔ اُن کے افسانے ماضی سے گہرا ربط رکھتے ہیں، جہاں موت، زوال اور مایوسی جیسے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ عناصر صرف غم کے اظہار تک محدود نہیں بلکہ ایک زوال پذیر تہذیب کے آثار کو بھی نمایاں کرتے ہیں، خاص طور پر لکھنؤ کی علمی و ثقافتی تنزلی کو۔ نیئر مسعود نے اپنے افسانوں میں علوم و فنون کے زوال کے المیے کو بیان کیا ہے، جو کبھی لکھنؤ کے شائستہ اور نفیس ماحول میں پروان چڑھے تھے۔ ان کا تخلیقی کام اس عہد کے لیے ایک نوحہ ہے جب لکھنؤ علم و ہنر کا مرکز تھا اور یہاں کی علمی و فنی روایات اپنی مثال آپ تھیں۔ یہ شہر نہ صرف علوم و فنون کا گہوارہ تھا بلکہ یہاں ہر فن مہارت اور نفاست کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔

لکھنؤ کے وہ خاندان جو مختلف علوم و فنون سے وابستہ تھے، اپنی مہارت کو اپنی پہچان سمجھتے تھے۔ یہ ہنر نہ صرف ان کے روزگار کا ذریعہ تھا بلکہ ان کے خاندانی وقار اور روایتی ورثے کی علامت بھی تھا۔ ہر نئی نسل اس فن کو مزید نکھارتی اور اسے ترقی دیتی، جس سے ان کی شناخت اور مضبوط ہوتی۔ تاہم، بدلتے وقت، کمزور سرپرستی، اور سماجی و سیاسی حالات نے ان روایات کو شدید نقصان پہنچایا۔ نیئر مسعود کے افسانے اس زوال کو ایک گہری اداسی اور فکری سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کیسے ایک زمانے کے معتبر فنون رفتہ رفتہ مٹتے گئے اور آخر کار ماضی کا ایک خاموش نشان بن کر رہ گئے۔

لکھنؤ کا علمی و فکری ماحول ہمیشہ سے برصغیر میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا، جہاں حکمت، طب، خوشبو، چکن کڑھائی اور تعمیرات جیسے فنون اپنی معراج پر تھے۔ یہ فنون نہ صرف لکھنؤ کی تہذیبی شناخت کا حصہ تھے۔ ہر فن اپنی باریکیوں، مہارت اور روایت میں منفرد تھا اور نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ نیئر مسعود نے اپنے افسانوں میں ان فنون کے زوال کو ایک گہرے المیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کیسے یہ روایتی علوم، جو صدیوں تک ترقی کرتے رہے، بدلتے ہوئے حالات کے باعث دم توڑ گئے۔ طبّی میدان میں جہاں کبھی حکما کی دانشمندانہ تشخیص اور جڑی بوٹیوں پر مبنی نسخے مقبول تھے، وہاں ان کی جگہ انگریزی ڈاکٹروں اور مغربی ادویات نے لے لی۔ اسی طرح، خوشبو سازی کا وہ نایاب فن، جس میں مخصوص قدرتی اجزا سے خوشبو تیار کی جاتی تھی، معدوم ہو گیا۔ آج وہ لطیف اور پیچیدہ خوشبوئیں، جو کبھی لکھنؤ کے بازاروں میں مہکتی تھیں، قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔

چکن کڑھائی، جو لکھنؤ کی ایک منفرد پہچان تھی، وہ بھی زوال پذیر ہو گئی۔ ایک ایسا ہنر، جو ہاتھ کی باریک کاریگری اور صبر آزما محنت کا متقاضی تھا، جدید صنعتی دور کے تقاضوں کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ یہی حال فن تعمیر کا ہوا، جس میں کبھی انتہائی نفیس اور پیچیدہ طرز کے نقش و نگار تخلیق کیے جاتے تھے۔ وہ عظیم الشان عمارتیں اور باغیچے، جن کی بناوٹ میں تہذیبی شناخت جھلکتی تھی، وقت کی گرد میں کھو گئے۔

نئیر مسعود نے اپنی پوری زندگی لکھنؤ میں بسر کی۔ ان کے افسانوں میں لکھنؤ کی گلیوں، قدیم حویلیوں اور روایات کے امین بزرگوں کے لیے محبت کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ خاص طور پر ان علوم و فنون سے گہری دلچسپی رکھتے تھے جو کبھی اس شہر میں فروغ پاتے رہے۔ تاہم، یہ تحسین ایک گہرے رنج کے ساتھ جُڑی ہوئی تھی، کیونکہ انہوں نے ان ثقافتی اور علمی سرمائے کے بتدریج زوال کا عینی مشاہدہ کیا۔ ان کی تحریریں اس احساسِ محرومی کی غماز ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی بیشتر ادبی تخلیقات لکھنؤ کے معدوم ہوتے ہوئے عروج کو محفوظ کرنے کے لیے وقف کیں۔

اُن کے افسانوی موضوعات محض اتفاقی نہیں، بلکہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جس نقصان پر انہیں سب سے زیادہ افسوس تھا، وہ روایتی طب کا زوال تھا۔ یہ افسوس ان کے لیے ذاتی نوعیت کا بھی تھا، کیونکہ ان کے دادا اور دادی طب کے پیشے سے وابستہ تھے۔ اگرچہ نئیر مسعود نے انہیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، کیونکہ وہ اپنے خانوادے کے آخری معالج تھے، تاہم وہ ان کے متعلق روایات اور داستانیں ضرور سن کر بڑے ہوئے تھے۔ یہ داستانیں، جو نسل در نسل منتقل ہوئیں، غالباً اُس عہد کے طبیبوں کی علمی وجاہت، فنی مہارت اور ان کے امتیازی اوصاف کے متعلق ان کے شعور کو تقویت دینے کا بنیں۔

نئیر مسعود لکھنؤ میں وقوع پذیر ہونے والی وسیع تر تبدیلیوں سے بھی فکری سطح پر آگاہ تھے۔ یہ وہی شہر تھا جو کبھی بادشاہوں، شعرا اور علما کا مرکز تھا، جو اپنی تہذیبی برتری، ثقافتی تنوع اور علوم و فنون کی سرپرستی کے لیے شہرت رکھتا تھا۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں علم و ہنر کی آبیاری ہوئی اور کاریگروں، دانشوروں اور طبّی ماہرین کی نسلیں پروان چڑھیں۔ تاہم، بدلتے ہوئے وقت اور اجتماعی و سیاسی حالات کے تغیر کے ساتھ، یہ علمی و تہذیبی ورثہ زوال پذیر ہوتا گیا۔ وہ عظمت، جو کبھی لکھنؤ کی پہچان تھی، آہستہ آہستہ ماند پڑتی گئی اور بالآخر تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو گئی۔ اپنے تخلیقی ادب کے ذریعے نئیر مسعود نے نہ صرف اس تہذیبی المیے کو پیش کیا، بلکہ قارئین کو ثقافتی وراثت کے تغیر و زوال پر غور و فکر کی دعوت بھی دی۔

لکھنؤ کی طبّی روایت، خصوصاً یونانی طب کے تناظر میں، ایک نمایاں تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نظامِ علاج دہلی سے لکھنؤ متعارف کرایا گیا، جس کے نتیجے میں یہاں طبّی علوم و فنون کے فروغ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ یونانی طب کا ایک اہم مرکز بن گیا، جہاں نہ صرف برصغیر بلکہ ایران سے بھی ماہر معالجین آئے۔ ایران، جو یونانی طب کے علمی ورثے میں اپنی ممتاز حیثیت رکھتا تھا، وہاں کے نامور اطباء نے بھی لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس دور میں لکھنؤ میں ماہر اطبا کی کثرت ایسی تھی جو کسی اور خطے میں دیکھنے کو نہ ملتی۔ یہی سبب تھا کہ یہ شہر طبّی مہارت و فضیلت کا استعارہ بن گیا۔

لکھنؤ میں طبّی ماہرین کی غیر معمولی صلاحیت اس عہد کی ایک منفرد پہچان تھی۔ یہاں ایسے نابغہ روزگار معالجین پیدا ہوئے جن کی مہارت اور فنی برتری مسلمہ تھی۔ تاہم، یونانی طب میں ہونے والی ترقی کے باوجود، ایک قابلِ ذکر مسئلہ طبّی نسخوں اور طریقۂ علاج کی رازداری تھا۔ متعدد طبّی تراکیب اور نسخے عوامی سطح پر دستیاب نہ تھے، کیونکہ معالجین نے انہیں اپنے دائرۂ اختصاص تک محدود رکھنے کو ترجیح دی۔ اس رجحان کی ایک بڑی وجہ لکھنؤ میں اطباء کے مابین پائی جانے والی مسابقت تھی۔ چونکہ یہاں بے شمار ماہر اور معروف معالج موجود تھے، اس لیے ہر طبیب کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے فن میں کوئی انفرادیت پیدا کرے تاکہ خود کو ممتاز رکھ سکے۔ چنانچہ، بہت سے اطباء نے جان بوجھ کر اپنے طبّی علوم کو پوشیدہ رکھا تاکہ ان کی مہارت اور طریقۂ علاج ایک نادر علمی و فنی سرمایہ بنا رہے۔

معاشرتی سطح پر معالجین کی اہمیت کے پیشِ نظر، ان کے کردار اور ذمہ داریوں کو منظم کرنے کے لیے کچھ اخلاقی اور پیشہ ورانہ اصول مرتب کیے گئے۔ ان اصولوں کے تحت طبیب کے طرزِ عمل، فرائض اور مریضوں و سرپرستوں سے ان کے تعلقات کو ایک ضابطے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ طبیبوں کا سماجی مرتبہ نہایت بلند تھا اور انہیں معاشی طور پر بھی ایک خوشحال زندگی میسر تھی۔ باضابطہ تنخواہوں کے علاوہ، انہیں مختلف مواقع پر تحائف اور اعزازات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ سماجی اثر و رسوخ کے لحاظ سے بھی ان کا مقام نہایت بلند تھا، اور وہ علمی و روحانی شخصیات کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے۔ وہ معالجین جو انتظامی قابلیت اور سیاسی بصیرت رکھتے تھے، انہیں طبّی پیشے سے آگے بڑھنے کے مواقع بھی حاصل ہوتے۔ بعض طبیب ایسے بھی تھے جو اپنی حکومتی مہارت کے باعث اہم سرکاری مناصب تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ شاہی دربار میں شمولیت معالجین کے لیے ایک بڑی کامیابی تصور کی جاتی تھی، کیونکہ یہ نہ صرف ان کے فن کی برتری کی علامت ہوتی بلکہ انہیں درباری سرپرستی بھی حاصل ہو جاتی۔ تاہم، دربار تک رسائی کا عمل سخت امتحان کا متقاضی تھا۔ بادشاہ اور حکومتی عہدیدار کسی بھی طبیب کے علم و مہارت کو پرکھنے کے بعد ہی اسے دربار میں شامل کرتے، تاکہ صرف اعلیٰ ترین قابلیت کے حامل معالجین کو شاہی خدمت کا موقع دیا جا سکے۔

یوں، لکھنؤ کی طبّی روایت علمی برتری، پیشہ ورانہ مسابقت، سماجی وقار اور سیاسی و ثقافتی اثرات کے امتزاج سے عبارت تھی۔ ان ماہر معالجین کی علمی و طبّی خدمات نے لکھنؤ کو یونانی طب اور طبّی تحقیق کا ایک مرکزی مقام بنا دیا، جس کی تاریخی اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> ''مجھے بھی خواہش ہوئی کہ باشاہ کا تقرب حاصل کروں۔ آخر استاد نے ایک دن مجھے لے جا کر ان کی خدمت میں پیش کیا اور میری بہت تعریفیں فرمائی۔ حضرت نے باتوں ہی باتوں میں میرا اچھی طرح امتحان کیا۔ خود بھی نکتہ سنج تھے، میرے علم و فضل کا بخوبی اندازہ کر کے مجھ کو بھی اپنے ہم نشینوں میں شامل کر لیا۔''(1)

لکھنؤ میں طبّی مشق کی تاریخی اہمیت شاہی درباروں میں معالجین کے بلند مرتبے اور سماجی وقار کو نمایاں کرتی ہے۔ یہاں طبّی پیشہ صرف معاش کا ذریعہ نہیں تھا بلکہ علمی برتری اور شاہی سرپرستی کے حصول کا وسیلہ بھی تھا۔ حکمران طبقے کی حمایت یافتہ معالجین کو اعزازات اور مراعات حاصل ہوتیں، جو نسلوں تک منتقل ہوتیں۔ یہی علمی و تحقیقی فضا نہ صرف برصغیر بلکہ بیرون ملک کے طبّی ماہرین کو بھی لکھنؤ کی طرف متوجہ کرتی، تاکہ وہ یہاں کے ماہرین سے مستفید ہو سکیں۔

نیئر مسعود کا افسانہ *دستِ شفا* ایک ایسے طبیب کی علمی جستجو کو بیان کرتی ہے، جو لکھنؤ کے ماہر معالجین کی شہرت سن کر وہاں جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ فیض آباد کا یہ باشندہ، اپنے شہر میں طبّی تعلیم کی کمی کے باعث تذبذب کا شکار ہوتا ہے، جبکہ لکھنؤ جامع طبّی علوم کا مرکز تھا۔ یہ بیانیہ طبّی تعلیم میں علمی رہنمائی کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ جب مرکزی کردار اپنی تعلیم کے بارے میں غیر یقینی کا شکار ہوتا ہے تو وہ ایک تجربہ کار عالم سے مشورہ کرتا ہے، جس کے مشورے پر بالآخر وہ لکھنؤ منتقل ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہ بیان نہ صرف لکھنؤ کی حیثیت کو ایک نمایاں طبّی و علمی مرکز کے طور پر ظاہر کرتا ہے بلکہ علمی فضیلت کے متلاشی افراد کی فکری ہجرت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس دور میں لکھنؤ کا طبّی منظر نامہ معالجین، اساتذہ اور سرپرستوں کے ایک منظم نظام پر مشتمل تھا، جو طبّی علوم کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کر رہا تھا۔ اس ضمن میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''حکیم صاحب نے ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کو بھی یہ دقت پیش آئی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ شرحوں سے بعد بھی قانون اور خود بعض شرحیں پڑھانے والے استاد کی ضرورت رہتی ہے، اور انہیں قانوں پڑھنے کے لیے لکھنؤ جانا پڑا تھا۔ پھر انہوں نے لکھنؤ میں دستیاب سرحوں اور وہاں کے حکیموں کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ میں نے لکھنؤ جانے کا فیصلہ کر لیا۔''(2)

لکھنؤ برصغیر کا وہ علمی و ثقافتی مرکز تھا جہاں علوم و فنون کی ترقی اپنے عروج پر رہی۔ یہ شہر ہمیشہ سے دانشوروں، شاعروں، فنکاروں اور اہلِ کمال کی توجہ کا مرکز رہا، جو یہاں علمی و فکری جستجو کے لیے آتے اور اپنی صلاحیتوں کو جِلا بخشتے۔ لکھنؤ کی علمی و ادبی روایت اس کے تہذیبی وقار کی آئینہ دار تھی، جہاں علم کی روشنی نے مختلف شعبوں میں نادر خیالات اور تخلیقی اظہار کے امکانات پیدا کیے۔

یہ شہر اردو ادب، فلسفہ، اور علوم و فنون کا مرکز تھا، جس میں اربابِ علم و دانش نے اپنے افکار کی آبیاری کی۔ حکمرانوں کی سرپرستی اور علمی فضاؤں نے لکھنؤ کو ایسا ماحول فراہم کیا جہاں طالب علم اور فنکار کم محنت میں بھی غیر معمولی ترقی کر سکتے تھے۔ علمی و فنی تربیت کے یہ مواقع اسے برصغیر میں ایک منفرد مقام عطا کرتے تھے۔

تاہم، لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کا ایک متضاد پہلو بھی تھا۔ جہاں یہ شہر علمی و فکری ترقی کی آماجگاہ تھا، وہیں اس کی پرتعیش زندگی اور رنگین محفلیں بعض افراد کے زوال کا سبب بھی بنیں۔ وہی شہر جو قابلیت اور ہنر کو ترقی کی معراج پر لے جاتا، بعض کے لیے زوال کی گہرائیوں کا راستہ بھی ہموار کر دیتا۔ یہاں کے تمدنی اور سماجی رویے بعض افراد کو علمی و فنی

عظمت عطا کرتے، جبکہ دیگر کو بے راہ روی اور اخلاقی زوال کی جانب دھکیل دیتے۔اس طرح لکھنؤ نہ صرف ترقی کا مرکز تھا بلکہ اس کی تہذیب میں شدت پسندی اور اعتدال کے دو متوازی دھارے بھی موجود رہے۔اس علمی و ثقافتی مرکز کا اثر محض اس کی حدود تک محدود نہیں تھا، بلکہ پورے برصغیر میں اس کے افکار و نظریات کی گونج سنائی دیتی تھی۔ یہاں کے محققین، شعرا، اور فنکاروں کی کاوشیں اردو ادب، موسیقی، خطاطی، اور دیگر فنون میں نئے زاویے متعارف کرانے کا سبب بنیں، جنہوں نے علمی و فکری مکالمے کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''سب سے پتے کی بات حکیم علی الفضل خان صاحب نے کہی تھی کہ لکھنؤ میں رہ کے آدمی بننا چاہے تو بہت کچھ بن سکتا ہے اور بگڑنا چاہے تو جی کھول کر بگڑ سکتا ہے۔ مجھ کو صرف ایک بات سے مطلب تھا کہ یہاں علماء اور اطبا بہت ہیں اور وہ دوسروں کو علم سکھانے میں دریغ نہیں کرتے۔''(3)

لکھنؤ ہمیشہ سے علمی و فکری عظمت کا استعارہ رہا ہے۔اس شہر کی علمی روایت نہ صرف اپنے عہد میں بے مثال تھی بلکہ اس کے اثرات صدیوں بعد بھی علمی دنیا میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ یہاں کے علماء و فضلاء، اطباء و محققین اور دانشوروں کا علمی مقام برصغیر میں کسی دوسرے خطے میں نہیں پایا جاتا تھا۔ لکھنؤ میں موجود اہلِ علم و فن کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فیاضی اور وسعتِ قلبی تھی۔ وہ اپنی تعلیمات کو محدود رکھنے یا مخصوص طبقات تک محدود کرنے کے بجائے ہر اُس شخص کے لیے دستیاب رکھتے جو سیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔ان کے لیے علم کوئی پوشیدہ راز نہ تھا، بلکہ وہ اسے ایک ایسی امانت سمجھتے تھے جسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو بھی فرد علم کی پیاس لے کر ان کے دروازے پر آتا، وہ نہ صرف اس کا استقبال کرتے بلکہ اسے سیکھنے کے مواقع بھی فراہم کرتے۔

اس دور کے علماء اور اطباء کا طرزِ عمل آج کی روایتی درس گاہوں سے مختلف تھا۔ جدید تعلیمی اداروں میں علم کے حصول کے لیے مخصوص شرائط اور رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں، لیکن لکھنؤ کے علمی مراکز میں یہ روش نہیں تھی۔ یہاں علم و فنون سیکھنے کے خواہشمند افراد کو خوش دلی سے قبول کیا جاتا، اور اساتذہ اپنی ذاتی دلچسپی اور محنت سے انہیں تعلیم دیتے۔ یہ اس علمی شہر کی وہ روایت تھی جس نے اسے محض ایک تعلیمی مرکز ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی و فکری منبع بنا دیا۔ خاص طور پر طب، فلسفہ، منطق، ادب اور اسلامی علوم کے ماہرین اس شہر میں ایسے انداز میں علم کی آبیاری کر رہے تھے جو دیگر شہروں میں شاذ و نادر دیکھنے کو ملتا تھا۔ طبیبوں کا علم صرف علاج معالجے تک محدود نہ تھا بلکہ وہ اپنے شاگردوں کو طب کی گہرائیوں میں لے جا کر انہیں ایک مکمل معالج بنانے کی کوشش کرتے۔اسی طرح اہلِ فلسفہ و منطق اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت اس انداز میں کرتے کہ وہ صرف تقلید پر اکتفانہ کریں بلکہ استدلال اور تحقیق کی روش اپنائیں۔

لکھنؤ کی علمی فیاضی کا ایک اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ یہاں کے اساتذہ نے کبھی کسی کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھا۔ وہ علم کو صرف مخصوص طبقات تک محدود کرنے کے بجائے، ہر قابل اور سنجیدہ طالب علم کو برابر کے مواقع

فراہم کرتے۔ یہ وہ پہلو تھا جس نے لکھنؤ کو ایک مثالی علمی و تحقیقی مرکز میں تبدیل کر دیا اور اسے ایسے علماء و فضلاء کی سرزمین بنا دیا جن کے علمی آثار آج بھی زندہ ہیں۔ اقتباس دیکھیئے:

> ''میری خوش قسمتی نے حکیم غازی الدین صاحب تک پہنچا دیا۔ وہ خاندانی طبیب اور بڑے ذی علم تھے۔ فقہ میں سید العلماء کے شاگرد تھے۔ خوبصورت جوان تھے۔ ان سے مراسم ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ درسِ حکمت بھی دیتے ہیں اور قانوں پڑھانے کے ماہر ہیں۔ یہ خدا ساز بات تھی ۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ان سے قانوں پڑھ کر بس مطب شروع کر دینا چاہیے۔ ان سے عرض مدعا کیا۔ انہوں نے بخوشی قبول کیا اور میں نے کتاب ان سے پڑھنا شروع کی۔''(4)

لکھنؤ کے علمی ماحول کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ کسی ایک علم کے ماہرین دیگر علوم سے بھی وابستگی رکھتے تھے۔ ایک طبیب صرف علاج و معالجہ تک محدود نہ رہتا بلکہ اسے قانون، فلسفہ، فلکیات اور دیگر علوم میں بھی مہارت حاصل ہوتی۔ اس وسیع علمی افق کی وجہ سے لکھنؤ کے اطبا (حکما) کا معاشرتی مقام نہایت بلند تھا۔ وہ نہ صرف معالج کے طور پر جانے جاتے بلکہ دانشور، فلسفی اور محقق کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے۔

لکھنؤ میں طب محض ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک فن اور روایت تھی، جو استاد سے شاگرد تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی تھی۔ یہاں کے اطباء جڑی بوٹیوں اور روایتی علاج کے ماہر تھے اور وہ صرف جسمانی امراض کے معالج نہیں تھے، بلکہ وہ طبّی فلسفے، مزاج شناسی، اور نفسیاتی اثرات پر بھی گہری بصیرت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ کے طبیب صرف ایک مخصوص دائرے میں محدود نہیں تھے، بلکہ وہ قانون، ادب، اور دیگر سائنسی مضامین میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ یہ علمی وسعت نہ صرف فرد کے علمی ارتقا کا نتیجہ تھی بلکہ ایک مضبوط ثقافتی روایت کا حصہ بھی تھی، جس میں مختلف علوم کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا تھا۔ ایک طبیب کے لیے ضروری تھا کہ وہ فلسفے، منطق اور اخلاقیات سے بھی واقف ہو تاکہ وہ اپنے مریضوں کی جسمانی صحت کے ساتھ ان کی ذہنی و نفسیاتی صحت کو بھی بہتر بنا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ میں اطبا کو معاشرے میں نہایت عزت و وقار حاصل تھا، اور انہیں نہ صرف معالج بلکہ معاشرتی رہنما بھی تصور کیا جاتا تھا۔

لکھنؤ میں طب کی یہ شاندار روایت اس وقت زوال پذیر ہونے لگی جب برطانوی حکومت نے برصغیر میں اپنا اقتدار مستحکم کرنا شروع کیا۔ برطانوی سامراجی پالیسیوں نے جہاں برصغیر کے دیگر شعبہ جات کو متاثر کیا، وہیں روایتی علوم اور طبّی نظام کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ انگریزوں نے روایتی اطبا کی جگہ اپنے جدید طبّی ادارے قائم کیے، جہاں یورپی طرزِ طب یعنی ایلوپیتھی کو فروغ دیا گیا۔ ان طبّی اداروں کے قیام کا مقصد نہ صرف مقامی طبّی روایات کو کمزور کرنا تھا بلکہ برطانوی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اپنی طبّی تعلیم کو مسلط کرنا بھی تھا۔

انگریزوں نے جدید سائنسی علوم کے نام پر طبِ یونانی اور روایتی حکمت کو قدیم، غیر سائنسی اور غیر مؤثر قرار دیا، جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہ علوم پس منظر میں چلے گئے۔ انگریزی ادویات اور ہسپتالوں کے قیام نے مقامی اطباء کے پیشے کو متاثر کیا اور وہ سرکاری سرپرستی سے بھی محروم ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تعلیمی سلسلہ جو صدیوں سے شاگردوں کے ذریعے آگے منتقل ہو رہا تھا، منقطع ہو گیا اور نئی نسلوں کو یہ روایتی علوم سیکھنے کے مواقع کم ملنے لگے۔

برطانوی اقتدار کے دوران مقامی نظامِ تعلیم کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ مکتبوں اور مدارس میں جہاں پہلے فلسفہ، منطق، علم طب اور دیگر علوم پڑھائے جاتے تھے، وہاں اب برطانوی نصاب نافذ کیا جانے لگا، جس میں مغربی سائنسی علوم اور انگریزی زبان کی فوقیت دی گئی۔ اس تبدیلی نے مقامی دانشورانہ روایت کو مزید کمزور کر دیا۔ روایتی طب کو صرف علمی محاذ پر ہی نہیں بلکہ معاشرتی اور اقتصادی سطح پر بھی نقصان پہنچا۔ پہلے اطبا کو درباری سرپرستی حاصل ہوتی تھی اور ریاستی تعاون ملتا تھا، لیکن انگریزوں نے ان کی جگہ اپنے سرکاری ڈاکٹر متعارف کرائے جو مغربی طب کے تحت علاج کرتے تھے۔ انگریزی ڈاکٹروں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے روایتی اطبا کے کردار کو مزید محدود کر دیا۔

برطانوی اقتدار کے نتیجے میں طبِ یونانی اور دیگر روایتی علوم صرف پیشہ ورانہ زوال کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافتی شناخت بھی متاثر ہوئی۔ انگریزوں نے اپنی ادویات اور طبّی نظام کو ترقی دی، جبکہ مقامی اطبا کو معاشرتی حیثیت اور معاشی استحکام سے محروم کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں نوجوان نسلوں نے ان علوم کی طرف رجحان کھونا شروع کر دیا، اور طبِ یونانی کی روایت آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی۔

یہ زوال صرف طبّی علوم تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک مکمل علمی و تہذیبی بحران کا پیش خیمہ بن گیا۔ وہ نوجوان جو کبھی اپنے بزرگوں سے روایتی حکمت، قانون اور فلسفہ سیکھا کرتے تھے، اب مغربی طرزِ تعلیم اور انگریزی زبان کے اثر میں آ گئے۔ اس عمل کے نتیجے میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا جو آج تک پر نہیں ہو سکا، اور ہماری علمی و ثقافتی میراث کا ایک اہم حصہ معدومیت کے دہانے پر پہنچ گیا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''کیوں بھائی صاحب آنے والے نے ذرا جھک کر پوچھا، یہاں کشن چند عطار کی دکان۔۔۔''
>
> ''یہی ہے۔۔۔ بیٹھے ہوئے آدمی نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جواب دیا۔ دکان تو یہی ہے لیکن اب۔۔۔۔ ویسے ہم پیٹنٹ حکیمی دوائیاں بھی رکھتے ہیں''
>
> آنے والا کچھ کہتے کہتے رکا۔ ایک دفعہ پھر اس نے کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ اس بار اسے دروازے سے لگا ہوا وہ چوکور سائن بورڈ بھی دکھائی دیا جس پر صلیب کے چھوٹے سے سرخ نشان کے نیچے ''کشن چند اینڈ سنز'' اور اس کے نیچے ''انگریز دوخانہ'' لکھا ہوا تھا''۔(5)

نیئر مسعود کے افسانے ''نوشدارو ''میں برصغیر کی روایتی طب، خاص طور پر حکمت کے زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ افسانہ نگار نے اس اقتباس میں اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ کس طرح ایک حکیم، کشن چند، کی اولاد نے اپنی معاشی مجبوریوں اور بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر حکیمی ادویات کو ترک کر کے انگریزی دواؤں کی فروخت شروع کر دی۔ یہ تبدیلی محض ایک خاندان تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس کے پیچھے ایک وسیع تر سماجی اور تہذیبی پس منظر موجود تھا، جو برطانوی استعمار کے اثرات اور مغربی طب کی مقبولیت کی عکاسی کرتا ہے۔

''نوشدارو ''فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معانی شراب، تریاق اور ایک مخصوص خوش ذائقہ، فرحت بخش معجون کے ہیں۔ اس افسانے میں ایک ایسے بوڑھے حکیم کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو پورے شہر میں اپنی حکمت اور جڑی بوٹیوں سے تیار کی گئی معجون کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا۔ وہ اپنے تیار کردہ مرکبات اور معجون کو ایک قدیم شاہی نسخے پر مبنی بتاتا ہے، جس کا اثر تب ظاہر ہوتا ہے جب دیگر تمام دوائیں ناکام ہو جاتی ہیں۔

تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ جب معاشرے میں حکمت اور حکیموں کی عزت و وقار میں کمی آنے لگی، تو وہ اپنے روایتی پیشے کو جاری رکھنے سے قاصر ہو گئے۔ حکمت کا یہ فن، جو صدیوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا، رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے لگا۔ برطانوی عہد میں انگریزی طب کے فروغ اور مغربی طرزِ علاج کی سرپرستی کے باعث روایتی حکمت اور یونانی طریقہ علاج کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی۔ نتیجتاً، وہ حکیم جو کبھی معاشرے میں عزت و احترام کا درجہ رکھتے تھے، اپنی شناخت کھونے لگے اور ان کا پیشہ بھی معدومیت کے دہانے پر پہنچ گیا۔

یہ افسانہ محض ایک حکیم کی کہانی نہیں، بلکہ ایک تہذیبی المیے کی عکاسی کرتا ہے، جہاں ایک علمی و طبّی ورثہ، جو صدیوں تک مشرقی ثقافت کا حصہ رہا، مغربی استعمار کے زیرِ اثر زوال پذیر ہو گیا۔ نیئر مسعود نے نہایت حسّاس انداز میں اس تغیر کو بیان کیا ہے، جو نہ صرف ماضی کے ایک درخشاں باب کو بند ہونے کی خبر دیتا ہے، بلکہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگر علمی و ثقافتی ورثے کو محفوظ نہ رکھا جائے، تو وہ ایک نہ ایک دن تاریخ کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''تیس سال پہلے ابا نے عطاری کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اصل میں ان سے دواؤں کی پہچان میں بھول چوک ہونے لگی تھی۔ ایک دن ایک جوان جوان حکیم صاحب دکان پر آکر بہت بگڑے کہ آپ میرے نسخوں پر اپنی حکمت نہ چلایا کیجئے۔ ابا نے کہا حکمت چلانے کی بات نہیں ہے۔ نسخے میں ایک دو غلط بندھ گئی تھیں۔ حکیم صاحب بولے اگر اس طرح غلط دوائیں بندھنے لگیں تو پھر مریضوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر کوئی ٹھکانے لگ گیا تو کہاں جاؤں گا۔ ابا کچھ نہیں بولے، حکیم صاحب بک جھک کے چلے گئے تو بھی کچھ نہیں بولے۔''(6)

برصغیر میں طبِ یونانی کے زوال، معاشرتی تبدیلیوں اور نئی طبّی روایات کے فروغ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خاندان، جو نسل در نسل طب کے فن سے وابستہ تھا اور جس کی وجہ سے اسے معاشرے میں ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل تھا، بتدریج اس روایت سے کٹتا چلا گیا۔ یہ تبدیلی محض کسی ایک فرد یا خاندان تک محدود نہ تھی، بلکہ یہ پورے لکھنؤ کی تہذیبی تاریخ کا ایک المناک باب تھا، جہاں طبّی ورثہ جدیدیت کے دباؤ کے باعث معدومیت کے دہانے پر پہنچ گیا۔

افسانہ ''نوشدارو'' میں بیان کردہ حکیم، جو اپنے وقت کا ایک ماہر طبیب تھا، بڑھاپے میں ضعفِ حافظہ کا شکار ہو گیا۔ وہ بعض اوقات مریضوں کو غلط دوائیں دے بیٹھتا، جس کے نتیجے میں اس نے علاج معالجہ ترک کر دیا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے خاندان کا آخری حکیم تھا۔ اس کی اولاد نے طب کے علم کو اپنانے سے انکار کر دیا، کیونکہ معاشرتی سطح پر حکمت کی وہ حیثیت برقرار نہ رہ سکی تھی جو لکھنؤ کے تہذیبی پس منظر میں ایک زمانے تک مسلمہ تھی۔ انگریزی طب کی آمد اور جدید میڈیکل سائنس کے فروغ نے روایتی طبِ یونانی کے ماہرین کو بتدریج حاشیے پر دھکیل دیا، اور وہ مقام، جو ایک وقت میں حکما کو حاصل تھا، انگریز ڈاکٹروں کے حصے میں آ گیا۔

یہ صرف ایک پیشے کا زوال نہ تھا، بلکہ لکھنؤ کی تہذیب کا ایک بڑا المیہ بھی تھا کہ جہاں کبھی اس فن کے چرچے دنیا بھر میں تھے، وہی عظیم روایت ایک صدی کے اندر اندر ماند پڑ گئی۔ یہ وہی فن تھا جو پشت در پشت منتقل ہوتا آ رہا تھا اور جس نے کئی نسلوں کو فیض پہنچایا تھا، لیکن نئی نسل نے اسے برقرار نہ رکھا۔ لکھنؤ کے باشندے، جو کبھی اس روایت کے امین تھے، خود اس علم سے محروم ہوتے چلے گئے۔

نیئر مسعود نے ''مراسلہ'' میں اسی موضوع کو ایک اور زاویے سے اجاگر کیا ہے۔ افسانے میں ایک ضعیف عورت کا کردار سامنے آتا ہے، جو خود بیماری کے باعث چلنے پھرنے سے قاصر ہے، مگر اس کا بیٹا اس کے علاج کے لیے انگریزی طب اور ڈاکٹروں سے رجوع کرتا ہے۔ تاہم، بوڑھی ماں کو یہ طریقہ علاج قابلِ قبول نہیں لگتا، کیونکہ وہ روایتی حکمت پر زیادہ یقین رکھتی ہے۔ اسے اپنے بیٹے کی صحت پر تشویش لاحق رہتی ہے اور وہ بار بار اس کی بیماری کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ بیٹا ان حکیموں کے پاس جائے جن کے پاس وہ خود اپنے بچپن میں جایا کرتی تھی ،وہی حکیم جو اپنی مہارت کے باعث پورے علاقے میں مشہور تھے۔

یہ افسانہ نہ صرف ماضی کے ایک شاندار طبّی ورثے کے زوال کو دکھاتا ہے بلکہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ نئی نسل روایتی حکمت سے کس طرح بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ جہاں ایک طرف جدیدیت اور مغربی میڈیکل سائنس کی ترقی نے طبِ یونانی کو پیچھے چھوڑ دیا، وہیں دوسری طرف معاشرتی بے حسی اور علمی ورثے سے غفلت نے اس زوال کو مزید تقویت دی۔ نتیجتاً، وہ روایت، جو صدیوں تک لکھنؤ کی ثقافت کا حصہ رہی، معدوم ہو گئی اور اس کا شعور رکھنے والے بزرگ محض یادوں میں اس عہد کو تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ موضوع محض طب کے زوال تک محدود نہیں، بلکہ ایک تہذیبی شکست کی علامت بھی ہے۔ نیئر مسعود کا بیانیہ اس المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب کوئی معاشرہ اپنے علمی، طبّی اور ثقافتی ورثے کی

حفاظت نہیں کرتا تو وقت کے دھارے میں وہ روایات اور اقدار صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''میری توقع کے خلاف انہوں نے بیماری کی تفصیل دریافت کرنے کی
بجائے صرف اتنا پوچھا: ''کسی کو دکھایا؟''
''کس کو دکھاؤں''
مجھے معلوم تھا وہ کیا جواب دیں گی۔یہ جواب وہ فوراً اور ہمیشہ تیز لہجے میں دیتی
تھیں لیکن اس بار انہوں نے دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی افسردگی اور
قدرے مایوسی کے ساتھ وہی بات کہی۔
''تم وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟''(7)

نیئر مسعود کے افسانے ''مراسلہ'' میں ایک ضعیف ماں کے کردار کے ذریعے اس عہد کے لوگوں کے احساسات اور رجحانات کو واضح کیا گیا ہے۔مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضعیف ماں نہ صرف انگریزی طریقہ علاج سے غیر مطمئن ہے بلکہ اپنی مادری شفقت کے زیرِ اثر اپنے بیٹے کو بیمار محسوس کرتی ہے، وہ اب بھی روایتی حکیمی علاج پر یقین رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا کم از کم ایک بار ان حکیموں کے پاس جائے، جن پر اسے مکمل بھروسا ہے۔اس کے نزدیک حکیم فوراً بیماری کی تشخیص کر لیں گے اور مناسب علاج تجویز کریں گے۔تاہم، بیٹا خود اس طریقہ علاج پر اعتماد نہیں رکھتا، مگر ماں کے مجبور کرنے پر وہاں جانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

یہ منظر نامہ اس وسیع تر رجحان کا حصہ ہے، جس کے تحت برصغیر میں جدید طب کی ترقی کے ساتھ ساتھ روایتی حکمت سے لوگوں کی وابستگی کمزور پڑتی گئی۔نوجوان نسل کا طبِ یونانی سے اعتماد اٹھ جانا اس علم کے زوال کا بنیادی سبب بنا۔ طبِ یونانی، جو نسلوں سے علمی و سائنسی بنیادوں پر ترقی کر رہا تھا، رفتہ رفتہ پس منظر میں چلا گیا، اور مغربی طب نے اس کی جگہ لے لی۔

نیئر مسعود کے ایک اور افسانے ''مارگیر'' میں بھی روایتی طریقہ علاج کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔اس افسانے میں مارگیر ایک ایسے کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جو جنگل میں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں مصروف رہتا ہے اور مار گزیدوں کا علاج اپنے روایتی علم سے کرتا ہے۔اس کہانی میں مارگیر نہ صرف ایک معالج بلکہ بے سہارا اور مجبور لوگوں کے لیے ایک مسیحا کے طور پر موجود ہے۔وہ ایک ایسی بستی میں رہتا ہے جہاں سانپوں کا خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے، اور کسی بھی فرد کو سانپ کے کاٹنے پر سب سے پہلے اسی کا نام لیا جاتا ہے۔

افسانے کے ایک منظر میں، جب رات کے سناٹے میں کسی شخص کو سانپ ڈس لیتا ہے، تو پورے گاؤں میں مارگیر کا نام گونجنے لگتا ہے۔یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اگرچہ جدید طبّی سہولیات آ چکی ہیں، لیکن کچھ علاقوں میں لوگ اب بھی قدیم طریقہ علاج پر انحصار کرتے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ طبِ یونانی کی مرکزی حیثیت ختم ہو

چکی تھی، لیکن اس کے اثرات مکمل طور پر زائل نہیں ہوئے تھے، اور مخصوص حالات میں لوگ روایتی معالجین کی طرف رجوع کرتے تھے۔

نیئر مسعود کے ان افسانوں میں ہمیں صرف طبِ یونانی کے زوال کی تاریخ ہی نہیں ملتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی تجزیہ بھی سامنے آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں پرانی نسل کی روایت پسندی اور نئی نسل کی جدیدیت پسندی کے درمیان تصادم نمایاں ہے، جو نہ صرف طب بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی ایک مستقل تبدیلی کی علامت بن چکا تھا۔ ایک اقتباس دیکھئے۔

> ''مارگیر مارگیر'' رات کے سناٹے میں یہ آواز گونجی۔ پکارنے والا کبھی بوڑھا ہوتا، کبھی جوان، کبھی کوئی عورت ہوتی اور کبھی کوئی بچہ، اس لیے ان آوازوں میں بڑا فرق ہوتا ہوگا۔ مگر مجھ کو سب آوازوں میں ایک ہی آواز معلوم ہوتی تھی''(8)

نیئر مسعود کے افسانہ'' مارگیر '' میں فضابندی کا عنصر نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس کے ذریعے قاری کے ذہن پر ایک انجانے خوف کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کہانی میں سانپوں کی موجودگی، رات کا سناٹا، اور مار گزیدہ افراد کی بے بسی، ایک ایسا منظر نامہ تخلیق کرتے ہیں جو کہانی کے مجموعی تاثر کو گہرا اور پراسرار بنا دیتا ہے۔ تاہم، اس کہانی کا سب سے دلچسپ پہلو مارگیر کا روایتی طریقہ علاج ہے، جو قاری کو کہانی سے جوڑے رکھتا ہے۔

افسانے میں مارگیر کی طبّی مہارت اور زہر مہرہ کے ذریعے علاج کے عمل کو نہایت باریک بینی سے بیان کیا گیا ہے۔ مارگیر کا علم تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے، اور اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ صرف ایک نظر ڈال کر یہ تشخیص کر لیتا ہے کہ مریض کو کس قسم کے سانپ نے کاٹا ہے۔ وہ زہر کی نوعیت کو پہچان کر اسی مناسبت سے علاج کرتا ہے، جو اس کے فطری اور روایتی طبّی علم کی برتری کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ تفصیلات نہ صرف افسانے کے کردار مارگیر کو ایک روایتی معالج کے طور پر نمایاں کرتی ہیں بلکہ اس بات کی بھی عکاسی کرتی ہیں کہ جدید طب سے قبل زہر کے علاج کے لیے کس طرح روایتی طریقے مستعمل تھے۔ نیئر مسعود نے کہانی میں مارگیر کے علاج کے ہر مرحلے کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس میں زہر مہرہ کے عمل اور جڑی بوٹیوں کے استعمال کی باریکیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''جنہیں واقعی زہریلا سانپ ڈستا ان کے علاج مارگیر کے پاس بہت تھے۔ جو ڈسنے والے سانپوں کی قسموں کے لحاظ سے بدلتے رہتے تھے۔ کسی شکار کے زخم پر وہ ایک طرح کی مٹی کا لیپ کرتا اور وہی مٹی پانی میں گھول کر اسے پلاتا بھی تھا۔ کسی کے زخم پر وہ کسی درخت کی کچلی ہوئی ہری چھال کا پھین دار رس

لگاتا اور کسی کے زخم سے بہت سا خون نکالنے کے بعد وہ زخم پر دوا کے دو ایک
قطرے ٹپکاتا۔۔۔''
''لیکن کوئی شکار ایسے سانپ کا کاٹا ہوا ہوتا یا زہر اس کے خون میں اتنا پھیل چکا
ہوتا کہ اس پر کوئی دوا کارگر نہ ہوتی۔ ایسے شکاروں پر مارگیر دوائیں آزماتا بھی
نہیں تھا۔ ان کے وہ زہر مہرہ نکالتا، زہر مہرے کا عمل ہمیشہ ایک سا ہوتا اور
کبھی خطا نہ کرتا تھا۔''(9)

بستی میں موجود مختلف قسم کے سانپ، جن میں بعض نہایت زہریلے اور بعض کم زہر والے ہوتے ہیں، اس امر کی علامت ہیں کہ انسانی زندگی میں بھی مختلف نوعیت کے خطرات اور مسائل موجود ہوتے ہیں۔ تاہم، مارگیر اپنی مہارت اور زہر مہرہ کے ذریعے ہر طرح کے سانپ کے کاٹے کا علاج کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ علاج بستی کے لوگوں کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا، کیونکہ زہر مہرہ کبھی ناکام نہیں ہوتا اور ہر زہریلے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

اس کہانی کا ایک اہم پہلو مارگیر کا خود اپنے زہر مہرہ سے خوفزدہ ہونا ہے، جو اس کے کردار کی داخلی کشمکش اور نفسیاتی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ گو کہ وہ دوسروں کے علاج میں مہارت رکھتا ہے، لیکن جب اسے خود سانپ کاٹ لیتا ہے تو وہ اپنے ہی طریقہ علاج پر اعتماد نہیں کر پاتا۔ یہ ایک گہرا علامتی اشارہ ہے جو اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ بعض اوقات وہی لوگ جو دوسروں کے مسائل حل کرتے ہیں، اپنی ذات کے مسائل سے نبرد آزما ہونے میں ناکام رہتے ہیں۔

افسانے کے اختتام پر مارگیر کا جملہ *"کسی کو بتانا مت مددگار، مگر مجھے یقین ہے کہ میں سانپ کے زہر کے سارے علاج بھول چکا ہوں"* اس کی بے بسی، ذہنی الجھن، اور شاید روایتی علوم کی زوال پذیری کا اظہار ہے۔ اس کا انتقال محض ایک فرد کی موت نہیں، بلکہ ایک ایسے قدیم علم کے خاتمے کی علامت ہے جو نسلوں سے منتقل ہوتا آ رہا تھا۔ راوی کا مارگیر کے بدن پر چٹائی ڈال کر بستی سے نکل جانا اس امر کا اشارہ ہے کہ ایک روایت کا باب بند ہو چکا ہے اور جدید دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔

یہ کہانی درحقیقت روایتی علوم کے زوال، جدیدیت کے اثرات، اور فرد کی نفسیاتی کشمکش کو ایک استعاراتی انداز میں بیان کرتی ہے۔ مارگیر محض ایک کردار نہیں، بلکہ ایک ثقافتی ورثے اور روایتی حکمت کا استعارہ ہے، جو بتدریج تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ مارگیر کی موت کا منظر دیکھیے۔

''اس کا چہرہ اس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کے نیچے تھا۔ اس لیے میں اسے
نہیں دیکھ سکا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔ لپٹی ہوئی چٹائی ابھی تک
میرے ہاتھ میں تھی۔ اب میں نے اسے کھولا اور مارگیر کے بدن پر ڈال
دیا۔ اس کے بعد باہر کی طرف کے حصے میں چلا آیا۔ کچھ دور تک مجھے آبادی
کے نشان ملتے رہے آخر وہ بستی بہت پیچھے رہ گئی۔''(10)

نیئر مسعود کے افسانے" مارگیر " میں نہ صرف ایک فرد کی موت کا المیہ بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ جڑے ایک قدیم اور نادر فن کے زوال کی تصویر بھی پیش کی گئی ہے۔ مارگیر کی موت کے بعد بستی میں سانپ کے ڈسنے کی چیخیں بھی ختم ہو جاتی ہیں، کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ اب کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو انہیں زہر کے اثر سے نجات دلا سکے۔ یہ المیہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ بعض اوقات کسی فرد کا انتقال محض اس کی ذات کا خاتمہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ علوم اور مہارتیں بھی اس کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں جو نسلوں تک لوگوں کی بقا کا ذریعہ بنی رہتی ہیں۔ افسانہ نگار نے یہاں مارگیر کے زہر مہرہ کے فن کو اس تہذیبی ورثے کا استعارہ بنایا ہے جو رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتا گیا۔

اسی طرح نیئر مسعود نے اپنے افسانے"عطر کافور " میں خوشبوئیں بنانے کی صنعت کے زوال کو بھی تہذیبی انہدام کے ایک اور پہلو کے طور پر پیش کیا ہے۔ لکھنؤ، جو کبھی خوشبوؤں کی تیاری کا مرکز تھا، آہستہ آہستہ اس فن کو کھوتا چلا گیا۔ افسانہ نگار نے نہایت باریک بینی سے اس قدیم صنعت کے زوال کی وجوہات بیان کی ہیں اور دکھایا ہے کہ جیسے اطباء کے علم کو جدید طب نے بے اثر کر دیا، ویسے ہی خوشبو سازی کی روایت بھی جدید معیشت اور صنعتی ترقی کی نذر ہو گئی۔

یہ دونوں افسانے دراصل لکھنؤ کی تہذیب میں فنون و علوم کے زوال کا نوحہ ہیں، جہاں قدیم طریقے معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے متبادل کے طور پر ایسی جدید روایات جنم لے رہی ہیں جن میں وہ روح اور گہرائی موجود نہیں جو پرانی نسلوں کے علوم و ہنر میں پائی جاتی تھی۔ نیئر مسعود کے ہاں یہ زوال محض معاشرتی تبدیلی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی المیہ ہے، جس میں نہ صرف فنونِ لطیفہ اور طب جیسے علوم کا زوال نظر آتا ہے بلکہ وہ مخصوص طرزِ زندگی بھی ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو لکھنؤ کی پہچان تھی۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''عطر بنانے کا وہ پیچیدہ اور نازک فن جو قدیم زمانوں سے چلا آرہا ہے۔ اور اب ختم ہونے کے قریب ہے۔ بلکہ شاید ختم ہو چکا ہے، میں نے نہیں سیکھا۔ مصنوعی خوشبوئیں تیار کرنے کے نئے طریقوں سے بھی واقف نہیں۔ اس لیے میرے بنائے ہوئے عطر کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور اس لیے اس کی نقل تیار کرنے میں بھی ابھی تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔''(11)

نیئر مسعود کے افسانے"عطر کافور " میں عطر سازی کے قدیم فن کے زوال کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ فنون محض ایک صنعت تک محدود نہیں تھے بلکہ لکھنؤ کی تہذیب کا ایک لازمی جزو تھے، جو نسل در نسل منتقل ہوتے رہے۔ لکھنؤ کی خوشبو سازی کی صنعت اس لیے بھی نمایاں تھی کہ وہاں کے فرمانروا اور عوام عطر کے دلدادہ تھے۔ صاف ستھرے لباس کے ساتھ خوشبو کا استعمال اہلِ لکھنؤ کی تہذیبی شناخت کا حصہ بن گیا تھا، جس کے نتیجے میں عطر سازی نے غیر معمولی ترقی کی۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فن اپنی اصل روح کھوتا گیا اور بالآخر زوال پذیر ہو گیا۔

نیئر مسعود کے افسانوں میں یہ زوال محض مادی یا تکنیکی ترقی کی وجہ سے نہیں، بلکہ تہذیبی گراوٹ اور بدلتی ہوئی ترجیحات کے باعث دکھایا گیا ہے۔ افسانہ نگار کو اس فن کے ختم ہونے کا شدید رنج ہے، کیونکہ اب نہ صرف عطر بنانے والے

ناپید ہو چکے ہیں بلکہ خوشبوؤں کی پہچان رکھنے والے بھی خال خال رہ گئے ہیں۔ یہ تہذیبی تغیر نہ صرف خوشبو سازی میں دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ دیگر قدیم علوم و فنون میں بھی یہی رجحان نظر آتا ہے۔

اسی طرح لکھنؤ کے فنِ تعمیر نے بھی نمایاں ترقی کی تھی اور یہ ہنر بھی وراثتی طور پر نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ قدیم عمارتوں میں تعمیراتی مہارت اور باریک بینی کے جو مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں، وہ اس فن کی بلندی کا ثبوت ہیں۔ تاہم، دیگر فنون کی طرح معماری بھی زوال پذیر ہو گئی اور جدید تعمیرات میں وہ نفاست اور خوبصورتی باقی نہ رہی جو لکھنؤ کی شناخت تھی۔

نیئر مسعود کے افسانے لکھنؤ کی تہذیبی گراوٹ کا نوحہ ہیں، جہاں عطر سازی، طب، فنِ تعمیر اور دیگر روایتی علوم و فنون کا زوال محض ماضی کی یاد نہیں بلکہ ایک تہذیب کے خاتمے کی علامت ہے۔ ان افسانوں میں ایک نوسٹلجیائی رنگ نظر آتا ہے جو قاری کو لکھنؤ کے در و دیوار سے وابستہ اس سنہری تہذیب کے کھو جانے کا احساس دلاتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ نیئر مسعود، گنجفہ، افسانہ: دستِ شفا، کراچی: شہر زاد، پاکستان، 2008ء، ص:165

2۔ ایضاً، ص:145

3۔ ایضاً، ص:148

4۔ ایضاً، ص:149

5۔ نیئر مسعود، گنجفہ (کلیات)، افسانہ: نوشدارو، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:192

6۔ ایضاً، ص:197

7۔ نیئر مسعود، گنجفہ (کلیات)، افسانہ: مراسلہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشن، ۲۰۱۵ء، ص:13

8۔ نیئر مسعود، گنجفہ (کلیات)، افسانہ: مارگیر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:357

9۔ ایضاً

10۔ ایضاً

11۔ نیئر مسعود، گنجفہ (کلیات)، افسانہ: عطر کافور، لاہور: سنگ میل پبلی کیشن، ۲۰۱۵ء، ص: 86